جوہرِ اقبال
علامہ اقبال پر شائع ہونے والا دنیا کا سب سے
پہلا وثیقہ
محمد حسنین سید

پیش لفظ

یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے جب سفر وسیلۂ ظفر ہوتا، سیروافی الارض کی قرآنی ترغیب رومان انگیز امکانات کو جنم دیتی اور شاعر بڑے ذوق وشوق سے یہ یقین دلاتا کہ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے   ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

چھریرے بدن کا ایک سانولا سلونا سا نوجوان جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں دہلی کی جانب عازم سفر تھا۔ وہ اپنی دانست میں اپنا سب کچھ خیر باد کہتے ہوئے ایک ایسی دنیا کی تلاش میں نکلا تھا جہاں اسے مستقبل کی منصوبہ بندی کی مکمل آزادی ہو۔ اپنا گھر بار، ماں باپ، عزیز و اقارب، لہلاتے کھیت اور پنگھٹ کی میٹھی یادیں سب کچھ وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ لیکن ابھی چند میل کا فاصلہ بھی طئے نہ پایا ہوگا کہ ریلوے اسٹیشن پر تن تنہا اس کی موجودگی سے بہت سے مسافر چونک اٹھے۔ والد علاقے کے معروف آدمی تھے سو اس حوالے سے لوگوں نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی کہ وہ اکیلا اس طرح کدھر کا قصد کرتا ہے۔ یہ بتانے پر کہ وہ بیرسٹر بننے کے بجائے ایک ایسا علمی مجاہد بننا چاہتا ہے جو اسلام کی عظمتِ رفتہ کو لوٹا سکے اور ان محرومیوں کا مداوا کر سکے جس سے پوری امت اس وقت دوچار ہے اور یہ کہ اس مقصد کی خاطر دہلی میں ایک نیشنل اسلامک یونیورسٹی پہلے ہی قائم ہوچکی ہے جہاں وہ تعلیم کی غرض سے جارہا ہے، لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ مختلف ٹرینوں کو ادلتے بدلتے وہ کسی طرح لکھنؤ پہنچا۔

لکھنؤ اسٹیشن سے جب وہ باہر نکلا تو سہ پہر کسی قدر ڈھل چکی تھی۔ اب وہ کھلے آسمان

کے نیچے تن تنہا تھا۔ اسے پہلی بار اپنی بے بسی اور تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ گھر بار اور عزیز واقارب کی محبّتوں کو وہ وطن میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھتیں ۔ وہ زیرِ لب کچھ کہنے کی کوشش کرتا لیکن ایسا محسوس ہوتا کہ شدت جذبات سے اس کی دعا حلق ہی میں گھٹ کر رہ جاتی ہو۔ پہلے پہل تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ جائے تو جائے کدھر۔ اسی ادھیڑ بن میں شام ہوگئی تب قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان نے اس کی رہنمائی کی۔

مسجد کے دالان میں کنویں کے گرد مٹی کے لوٹوں میں لوگ وضو کے لیے پانی بھر رہے تھے۔ چہل پہل کا سماں تھا۔ وہ بھی ایک لوٹے میں پانی لے کر وضو کے لیے جا بیٹھا۔ کچھ سفر کی تھکان، کچھ احساسِ بے بسی اور کچھ تائیدِ غیبی کا یقینِ واثق، وہ جب ہاتھوں سے اپنے چہرے پر پانی ڈالتا تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ اس وضو میں آنسوؤں کا حصہ زیادہ ہے یا پانی کا۔ اس کا رُواں رُواں ایک معجزے کا طلب گار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے خدا کی مدد آتے آتے رُک جاتی ہو۔ وہ اپنی عمر کے طویل ترین اور مشکل ترین وضو سے جب فارغ ہوا تو مغرب کی نماز کب کی ختم ہوچکی تھی۔ اسی اضطرابِ قلبی کے ساتھ اس نے جیسے تیسے نماز ادا کی اور پھر کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

اسٹیشن کی مسجد کسی پلیٹ فارم سے کم نہ تھی۔ مسافروں کا تھکاماندہ قافلہ گاہِ صبح گاہِ شام مسجد میں داخل ہوتا، نماز سے فراغت کے بعد کچھ دیر آرام کرتا اور پھر ٹرینوں کے مطابق اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجاتا۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران وہ قریب کے مسافر خانے سے موٹا جھوٹا کھانا خریدتا اور اگلی منزل کے لیے دل ہی دل میں منصوبے بناتا۔ شام کے وقت جب مسافر خانے کے دالان میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد مٹی کی سوندھی مہک اور حقّہ سے نکلتی ہوئی تمبا کو کی خوشبو ایک مانوس سا سماں پیدا کرتی تو اسے بے پناہ اپنے گھر کی یاد آتی۔ مسافر خانے کے صحن میں جہاں شام گئے گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا، حاضرین میں تاجر بھی ہوتے اور عالم بھی، حلقہ اشراف کے دعویدار بھی ہوتے اور جہانیاں جہاں گشت قسم کے لال بجھکڑ بھی۔ دیس بدیس کے قصے، مسافروں کی دلچسپ سرگزشتیں، بزرگوں کی محیرالعقول کرامتیں، تاج برطانیہ کے زوال کی پیش گوئی،

حکایات اور لطیفے اور ان جیسے دیگر موضوعات سے مسافر خانے کی چوپال دیر تک معمور رہتی۔ گاہے محفل بلند قہقہوں سے لالہ زار ہوجاتی اور گاہے اس پر سنجیدگی کا ماحول طاری ہوجاتا۔ نوجوان سید کے لیے مسافر خانے کی یہ چوپال ایک درسگاہ سے کم نہ تھی۔ اپنے آبائی گھر کے مردان خانے میں جہاں والد صاحب اپنی مجلس جماتے وہاں اس کی حیثیت محض ایک سعادت مند سامع کی ہوتی لیکن یہاں مسافر خانے کی اس بے تکلف گفتگو میں وہ خود کو برابر کا شریک سمجھتا۔ اسے اس بات کا شدید قلق تھا کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے مغرب زدگی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ ترکی ٹوپی کی جگہ انگریزی انداز کے ہیٹ اور مغربی لباس ان کا طرہ امتیاز بن گئے ہیں۔ بھلا اس مرعوبانہ ذہنیت سے خلافت کی بحالی کا کام کیسے انجام پاسکتا ہے۔ نوجوان سید جب اپنے مخصوص اور پر جوش انداز سے بزرگوں کی گفتگو میں حصہ لیتے اور اپنے موقف کی حمایت میں پر جوش دلائل کے انبار لگادیتے تو سامعین چند لمحوں کے لیے مبہوت ہوجاتے۔ خلافت کے باقاعدہ سقوط کو ابھی صرف دس سال گزرے تھے۔ محمد علی اور شوکت علی کی تحریک خلافت نے ملک بھر میں جو غلغلہ پیدا کیا تھا اس کی بازگشت ابھی فضا میں باقی تھی۔ عام مسلمان اس کرب کے ساتھ جیتے کہ ان کی قومی و ملی زندگی کا اندوہ ناک حادثہ، جس سے ان کی وحدت کا علامیہ پاش پاش ہوگیا تھا، ابھی چند ہی برسوں پہلے پیش آیا ہے۔ زوال امت کا زخم گویا ابھی تازہ تازہ تھا۔ اس پس منظر میں نوجوان سید کی باتوں میں بلا کا جادو محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا گویا بڑے دنوں بعد بجھے دلوں میں پھر سے امیدوں کے چراغ روشن ہوگئے ہوں۔

تب ایک دن، یہی کوئی اشراق کا وقت ہوگا، علماء وصوفیاء کا ایک قافلہ اسٹیشن کی مسجد میں وارد ہوا۔ اب تک مسجد اور اس کے اطراف میں مسافر خانے کے مکیں اور خدام نوجوان سید کی شخصیت سے واقف ہوچکے تھے جو ایک نئی صبح کے قیام کے لیے گھر سے نکلا تھا اور جو ایک مناسب قافلے کے انتظار میں اسی مسجد میں مقیم تھا۔ علماء وصوفیا کے اس قافلے کو دیکھ کر سید کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، پتہ چلا کل بعد نماز جمعہ ان لوگوں کا کانپور کا قصد ہے سو وہ اس خیال سے قافلے میں شامل ہوگیا کہ کانپور سے دہلی کا سفر کسی قدر آسان ہوجائے گا اور راستے میں اہل دل کی مشائیت بھی اسے حاصل رہے گی۔ کانپور کی اس مسجد میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے اس کے

اس خیال کو مزید تقویت ملی کہ وہ اپنے اس سفر میں تنہا نہیں بلکہ اسے اس رفیق اعلیٰ کا دست شفقت حاصل ہے کہ جس کے سبب ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

دوسرے دن اہل قافلہ نے مسجد میں اجتماعی طعام کا انتظام کر رکھا تھا۔ مقامی ارادت مندوں کے گھروں سے لذیذ مرغن کھانوں کے سجے سجائے خوان مسجد میں آ رہے تھے۔ لیکن نوجوان سید قریب کے تنور سے تازہ روٹی خرید کر شکم سیری حاصل کر چکا تھا۔ اگلے دن جب وہ فجر کی نماز کے بعد مسجد کے ایک گوشے میں دور خیالوں میں کھویا تھا، امام مسجد نے اس کے کاندھوں کو اپنے دست شفقت سے تھپتھپایا۔ وہ اس نئے مہمان کے بارے میں کچھ متجسس اور کسی قدر متحیر معلوم ہوتے تھے جس کی باتوں میں بلا کا جادو تھا اور جس کی اولوالعزمی سننے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ جو جبہ و دستار کا ناقد بھی تھا اور اس کا شیدائی بھی۔

''میاں صاحبزادے خدا آپ کے عزائم کو قائم رکھے لیکن یہ تو بتائیے کہ بہار میں کس علاقے سے آپ کا تعلق ہے؟''

تھوڑی سی کرید کے بعد جب امام مسجد کو یہ معلوم ہوا کہ وہ معروف صوفی بزرگ شاہ بشارت کریم کے عزیزوں میں ہیں تو خود امام مسجد اس کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے۔ کہاں تو غریب الوطنی اور بے بسی کا یہ عالم کہ سفر کی صعوبتیں اٹھاتے، قسطوں میں منزلیں طے کرتے اور اپنی تنگ جیب کے مطابق روکھا سوکھا کھا کر جیسے تیسے کانپور پہنچے تھے اور کہاں امام مسجد کی شکل میں ایک ایسے بااثر، مخلص و فہیم میزبان کی بازیافت جو اس نوجوان کی خدمت کو اپنے لیے اعزاز سے کم نہ سمجھتا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے مشیت الٰہی نے اس کے سفر کا پروگرام پہلے ہی سے طے کر رکھا ہو۔ چند دنوں کی تواضع اور مہمان داری کے بعد انھوں نے نوجوان سید کو تاجروں کے ایک قافلے کے ساتھ دہلی کے لیے الوداع کہا۔

دہلی پہنچ کر جس مسجد میں یہ قافلہ خیمہ زن ہوا وہاں بھی تائید ایزدی اس کے تعاقب میں لگی رہی۔

''میاں صاحبزادے تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، میں تمہاری پیشانی پر شاہِ بطحا کے نور کی چمک دیکھتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے امام مسجد نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بہت جلد دونوں میں بے تکلفی پیدا ہوگئی۔ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ میں کرایے کے مکان میں تھی۔ اندیشوں اور امکانات کے جلو میں تائید ایزدی کے یقین واثق کے ساتھ وہ جامعہ آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید اور نفیس فرش پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین فروکش ہیں۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں انھیں اپنے تمام منصوبوں سے آگاہ کردیا اور زعم خوداعتمادی میں یہ بھی کہہ ڈالا کہ عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے لیے کسی کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو اس کے پاس ایک ایسا منصوبہ ضرور ہے جو چشم زدن میں ایک نئی دنیا کی بنا ڈال سکتا ہے۔ ذاکر صاحب اس نوجوان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے کہ اس زمانے میں اساتذہ نوجوانوں کا اثر قبول کرتے تھے۔

اس زمانے کی جامعہ درویشوں کی ایک ایسی خانقاہ تھی جہاں فقر و استغنا کے ساتھ وقت کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دی جاتی۔ اساتذہ ملازم نہیں بلکہ مربی اور معلم ہوتے اور بسااوقات جامعہ کے مالی بحران کے پیش نظر اختیاری طور پر اپنی تنخواہوں میں تخفیف کا اعلان کر ڈالتے۔ قلندروں کی اس کہکشاں میں شیخ الجامعہ ذاکر حسین کے علاوہ عابد صاحب جیسے دانشور اور مجیب صاحب جیسے مورخ بھی تھے اور اسلم جیراج پوری جیسے روشن خیال عالم دین بھی۔ فکر ونظر میں یہ حضرات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ کوئی ہندوستانی قومیت کا علمبردار تھا تو کوئی عظمت رفتہ کا مرثیہ خواں، کوئی نئی روشنی کا دلدادہ تھا تو کسی کے لیے اسلام ایک ناگیز یر حوالہ۔ البتہ غور وفکر کے یہ مختلف سانچے ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے بجائے غیر معمولی وسعت قلبی کا ثبوت دیتے۔ ان سب کا درد مشترک تھا جس نے انھیں باہم مل کر کام کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ نوجوان سید کے لیے اساتذہ کی یہ بوقلمونی بڑا دلچسپ تجربہ ثابت ہوئی، جس نے انھیں دوسروں کے نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے اور مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فن سکھایا۔ بہت جلد جامعہ کی علمی برادری میں اس نے اپنی شناخت قائم کرلی یہاں تک کہ طلباء کے انجمنِ اتحاد کی سربراہی اس کے

حصے میں آئی اور طلبائے جامعہ کے رسالہ جوہر کا اسے مدیر نامزد کیا گیا۔

ایام طالب علمی میں اپنے شفیق استاد ذاکر حسین کے علاوہ اسے جس شخص نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ لاہور کا ایک احیائی شاعر تھا جس کا یہ شعر ؎

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

نوجوان سید اکثر زیرِلب گنگنایا کرتا تھا۔ ان کے سیکڑوں اردو اور فارسی اشعار اس کی نوکِ زبان پر ہوتے۔ دنیا جسے شاعرِ مشرق کے حوالے سے جانتی تھی وہ اس کے روز ناچے کا حصہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جب مکتبہ جامعہ سے بال جبریل چھپ کر آئی تو اس کی قیمت اس وقت تین روپے تھی جو ایک طالب علم کے لیے بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ سو سید نے اس کا حل یہ نکالا کہ لائبریری سے اس کتاب کو لاکر پوری کتاب اسی نفاست سے اپنی ڈائری میں نقل کرلیا۔ جامعہ ہی وہ مبارک درسگاہ تھی جہاں انھیں اپنے ممدوح شاعر کو دوبار قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور پھر ایک دن یہ خبر اس کے اعصاب پر بجلی بن کر گری کہ محمد اقبال، جس کی نوا سنجی سے اس کے فکر وعمل کو جلا ملتی تھی، اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ نوجوان سید نے محض آنسو بہانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسی شام مشاہیر دہلی کو ایک تعزیتی جلسہ پر جمع کرلیا۔ اسی جلسے میں انھوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ رسالہ جوہر اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لیے ایک خصوصی نمبر شائع کرے گا۔ اقبال کی موت کے بعد کسی بھی رسالے کی طرف سے یہ پہلا اعلان تھا۔ چند ماہ بعد جب رسالہ جوہر کا خاص شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کی حیثیت اقبالیات کے پہلے پتھر کی تھی۔ تب یہ بات شاید حسنین سید کے حاشیہ خیال میں بھی نہ رہی ہوگی کہ شاعر مشرق کو ان کا یہ خراج تحسین مطالعۂ اقبال کے ایک مستقل دبستان کے قیام پر منتج ہوگا اور طلبائے جامعہ کے اس رسالے کو اقبالیات کے نقشِ اولیں کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔

۲

شہر دربھنگہ کے مضافات میں ریلوے لائن کے اس پار جہاں اب معالجین اور شفاخانوں کی گویا ایک باڑھ سی آ گئی ہے کچھ آ گے چل کر مرحوم درسگاہ اسلامی کی ایک مسجد اب بھی قائم ہے۔ اسی مسجد کے پہلو میں مرحوم حسنین سید کی ابدی آرام گاہ بھی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ درسگاہ اسلامی کی ان باقیات اور ان سے ملحقہ کھیت وکھلیان سے بیسویں صدی کی ایک عظیم تحریک کی داستان وابستہ ہے۔ بات ۱۹۴۲ء کی ہے جب جماعت اسلامی کی دعوت پر مٹھی بھر افراد نے ایک نئی صبح کے قیام کے لیے باہم عہد وپیان کیا تھا۔ لاہور کے تاسیسی اجتماع کے بعد، جہاں ۷۵/افراد نے جماعت اسلامی تشکیل دی تھی، بہت جلد آپسی اختلافات، ذہنی ہم آہنگی کے فقدان اور شخصی انا کے ٹکراؤ کے سبب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جماعت انتشار کا شکار ہوجائے گی۔ دہلی کا اجتماع ، جو اس بحران کے سدباب کے لیے منعقد کیا گیا تھا کچھ مؤثر نہ ہوسکا کہ بعض کلیدی اراکین نے پہلے ہی مرحلے میں جماعت کو داغِ مفارقت دے ڈالا۔ ایسے حالات میں محمد حسنین سید جامعی نے دربھنگہ میں ایک اجتماع عام کا اعلان کر ڈالا۔ اس اعلان سے جماعت کو گویا ایک نئی زندگی مل گئی۔ اجتماع دربھنگہ جماعت کی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ گوکہ اس موقع پر ابوالاعلیٰ مودودی مقامی مخالفت کے سبب شہر میں عوامی جلسے کو خطاب نہ کر سکے لیکن ان کے چند روزہ قیام کے دوران مرکز سے دور دربھنگہ میں ایک نئے مرکز کا قیام عمل میں آ گیا۔ آنے والے دنوں میں اسلام نگر کی اس چھوٹی سی بستی سے بڑے بڑے رجال کار پیدا ہوئے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آزاد ہندوستان میں تحریک کی ابتدائی تنظیم کاری کا تمام تر منصوبہ اسی چھوٹے سے مرکز سے انجام پاتا رہا۔ تحریک کا بعض ابتدائی لٹریچر، پوسٹر اور ہینڈبل بھی یہیں شائع ہوا تاآنکہ جماعت کا باضابطہ اشاعت گھر رامپور میں قائم ہوگیا۔

شہر کے ہنگاموں سے دور جہاں جمہور مسلمان یا تو کانگریس کی متحدہ قومیت کے قائل تھے یا پھر مسلم لیگ کی علیحدہ قومی سیاست پر ایمان لے آئے تھے، اسلام نگر کی یہ مختصر مضافاتی آبادی

ایک نئے خیال کی آبیاری میں مصروف رہی۔ اوائل عمری میں محمد حسنین سید ایک نئی دنیا کے قیام کا جو منصوبہ لے کر جامعہ ملیہ گئے تھے اب تحصیل علم کے بعد کہیں بہتر پوزیشن میں تھے کہ وہ اسلامیان ہند کے لیے ایک بہتر منصوبے کی تشکیل کرسکیں۔ کہتے ہیں کہ جب وہ ایک دن جامعہ کے اقبال ہوسٹل میں اپنے کمرے سے نکل کر کسی کام سے باہر جارہے تھے دفعتاً ان کی نگاہ ایک جواں سال خوبصورت چہرے بشرے والے عالم دین پر پڑی جو کسی کمرے سے نکل کر باہر پان کی پیک پھینکنے کے لیے آئے تھے۔ سیاہ شیروانی، آنکھوں پر بڑے فریم کا چشمہ اونچی دیوار کی ٹوپی آنکھوں سے ذہانت اور چہرے پر جلال و جمال کا امتزاج نمایاں تھا۔ پتہ چلا کہ یہی وہ روشن خیال عالم دین ہیں جنھیں سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں اور جو اس وقت ایک مفکر اور مدبر کی حیثیت سے بڑی تیزی سے علمی افق پر نمایاں ہورہے تھے۔ ابوالاعلیٰ مودودی پیک پھینکنے کیا نکلے یہ بات حسنین سید سے ان کے تعارف کا بہانہ بن گئی۔ پہلی ہی گفتگو میں ایسا لگا جیسے دونوں کا خواب ایک ہو اور دونوں ہی مستقبل کی اسی دنیا کے باسی ہوں جس کا ظہور میں آنا ابھی باقی ہو۔ دونوں ہی اقبال کے مداحوں میں تھے جن کی بلند آہنگ شاعرانہ لے اس وقت کے برصغیر میں ایک نیا جادو جگارہی تھی۔ جامعہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حسنین سید کو دو مرتبہ اقبال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، لیکن تب اقبال کی صحت جواب دے رہی تھی۔ آخری بار ۱۹۳۵ء میں جب وہ خالدہ ادیب خانم کے لیکچر کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے احتباسِ صوت کے باعث تقریر نہیں کرسکے تھے۔ اور اس لیے، جیسا کہ حسنین سید نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے، انھیں اقبال سے تکلم کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔ اب ابوالاعلیٰ مودودی سے گفتگو کے بعد انھیں ایسا لگا جیسے وہ اقبال کے فکری منصوبے کو ایک عملی شکل دینے کے لیے کمرکس رہے ہوں۔ بات آئی گئی اور ان کے لاشعور کا حصہ بن کر رہ گئی۔ البتہ جب چند برسوں کے بعد انھیں یہ معلوم ہوا کہ ابوالاعلیٰ مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس منصوبے پر مسلسل غور وفکر جاری رکھا ہے بلکہ ہم خیالوں کی ایک انجمن جماعت اسلامی کے نام سے بناڈالی ہے تو آپ نے نہ صرف یہ کہ انھیں مبارکباد کا خط لکھا بلکہ اس مہم میں انھیں ہر قسم کی امداد کا یقین دلایا اور ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کرڈالی کہ آپ ایک بڑا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں اس کی عظمت کا پاس

رکھنا نہ بھولئے گا۔ پرانی ملاقاتوں کی یاد تازہ تھی لہٰذا کسی ادنیٰ تامل کے بغیر دربھنگہ کی سرزمین پر ایک اجتماع کے انعقاد کی پیشکش کر ڈالی۔

ابوالاعلیٰ مودودی سے تنظیمی وابستگی کے بعد حسنین سید نے اپنے اصلاحی مشن کو از سر نو منظّم کیا۔ مولانا مودودی کی ایما پر شہر دربھنگہ کے قلب میں مکتبہ اسلامی کے نام سے ایک اشاعتی اور تبلیغی ادارے کے بنا ڈالی۔ کچھ کتابچے خود تحریر کئے اور کچھ اس وقت کے متوسلین جماعت مثلاً نعیم صدیقی، امین احسن اصلاحی وغیرہ سے لکھوائیں۔ بعض مقامی احباب کے ساتھ مل کر ہمالہ کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ دیکھتے دیکھتے جماعت کی اس اجنبی دعوت کو اسی علاقے سے اتنے رجال کار میسر آ گئے کہ اس پوری ٹیم نے منقسم ہندوستان میں بڑی تندہی، جانفشانی اور اولوالعزمی کے ساتھ ایک کل ہند سطح کی جماعت منظّم کر ڈالا۔ خود حسنین سید تنظیمی کاموں کی توسیع اور بڑھتی مشغولیت کے سبب دربھنگہ چھوڑ کر پٹنہ، کلکتہ اور گوہاٹی منتقل ہوتے رہے۔ کثرتِ سفر اور منتقلیٔ مکان کے سبب یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ وہ دراصل اس پورے عرصے میں کہاں مقیم رہے ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

ساکن دربھنگہ کی اصطلاح تو پہلے بھی انھیں کفایت نہیں کرتی تھی اب نزیل کلکتہ یا نزیل گوہاٹی کی اصطلاحیں بھی ان پر صادق نہیں آتی تھیں۔ کبھی بس کے سفر میں کسی کو اسلام کی دعوت دے رہے ہیں تو کبھی جامعہ ملیہ کی یوم تاسیس پر اپنے احباب اور اساتذہ کے درمیان اسلام کے صحیح تصور پر گفتگو فرما رہے ہیں تو کبھی دہلی کے کسی جلسہ میں اپنا تحریر کردہ مقالہ اپنے بھتیجے نجیب اختر سے پڑھوا رہے ہیں اور کبھی اپنے عزیز دوست گورنر قدوائی کی دعوت پر خدابخش میموریل لکچر کے بہانے اپنے استاد ذاکر حسین کی بلندنگہی اور ان کے احسانات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ان کی شخصیت میں بلا کا جادو تھا۔ اہل مناصب ہوں یا اہل اقتدار، علماء ہوں یا دانشور یا کسی کو خاطر میں نہ لانے والے اصحاب سلوک، ان کی شخصیت کا جادو سبھوں پر یکساں چلتا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ سبھی ان سے دبتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ حالانکہ تمام عمر نہ وہ کسی منصب کے حامل رہے اور نہ ہی دنیاوی جاہ وحشم پر کبھی

انھیں متمکن ہونے کا موقع ملا۔ مالی اعتبار سے جو کچھ بھی انھیں موروثی طور پر ملا تھا وہ سب کچھ انھوں نے اس مشن میں لگا ڈالا۔ بلکہ اپنے تمام بھائیوں ،عزیز و اقارب اور قریب ترین احباب کو بڑی بڑی سرکاری نوکریوں کو ترک کرنے اور یکسو ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کام کرنے پر مائل کیا۔ اس طرح ان کے خاندان میں جو کبھی اچھے دنوں کا خوشحال متمول گھرانہ کہلاتا تھا عسرت اور تنگدستی نے ڈیرے ڈالے۔ لیکن فقر و فاقہ اور زہد و قناعت کے اس ماحول میں بھی ان کے اندر شاہِ نینوا کی شان جلوہ گر رہی۔

ذاکر صاحب جب گورنری اور نائب صدر کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے صدر جمہوریہ کے منصب تک جا پہنچے، اس تمام عرصے میں انھیں اپنے عزیز شاگرد حسنین سید کے خود اختیار کردہ فقر کا مسلسل سامنا رہا۔ ہر ملاقات پر وہ یہی کہتے رہے کہ میرے دل میں آپ لوگوں کے لیے بڑی قدر ہے اور میں آپ حضرات کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ تقسیم ہند کے بہت بعد تک، جب جماعت پر حکومتی عتاب سخت تھا اور اراکین جماعت پر حکومتی کارندوں کی کڑی نگاہ تھی ، اس وقت ذاکر صاحب کی مداخلت سے حسنین سید صاحب کو محکمۂ خفیہ کی بے جا ایذا رسانیوں سے بڑی راحت ملی۔ غالباً ۱۹۸۰ء کے ابتدائی عشرے کی بات ہے، جامعہ کا یوم تاسیس منایا جا رہا تھا۔ راقم الحروف بھی ان کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا۔ یکے بعد دیگرے اساتذہ اور دانشوروں کی زبانی ایسی تقریریں سننے کو مل رہی تھیں جن سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ حضرات جامعہ کے اسلامی ماضی پر شرمندہ ہیں یا کم از کم اس بارے میں معذرت خواہانہ رویہ رکھتے ہیں۔ طرفہ یہ کہ جامعہ کے ایک قدیم استاد محمد عاقل صاحب جو اپنے ملحدانہ خیالات کے لیے مشہور تھے جوش خطابت میں بعض ایسی باتیں بھی کہہ گئے جو حسنین سید کے لیے سخت خلجان کا باعث ہوئیں۔ آپ نے برملا اپنی تقریر میں نہ صرف یہ کہ اپنے استاد کی فکری لغزشوں کی نشاندہی کی بلکہ معذرت خواہانہ اسلام کے حاملین کو بانیانِ جامعہ کے فکری اور تاریخی شعور کی پر زور تلقین فرمائی۔ جامعہ کے مونوگرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ آپ حضرات کا حال ان دکانداروں کا ہے جو بورڈ پر تو یہ لکھتے ہیں کہ '' یہاں خالص دیسی گھی ملتا ہے'' لیکن دراصل وہ ڈالڈا فروخت کر رہے ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ کیسی

دیانت داری ہے کہ بورڈ پر تو آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ لکھ رکھا ہے جبکہ فی الواقعہ یہاں اسلام مخالف باتیں ہورہی ہیں اور ایک ایسے فکر ونظر کو فروغ دیا جارہا ہے جو اسلام کے عظیم الشان ورثے پر شرمندہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ محفل پر دفعتاً سکوت طاری ہوگیا۔ جب وہ اسٹیج سے اترے تو خود ان کے استاد محمد عاقل صاحب نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ کھانے کے وقفہ کے دوران دیر تک آپ کی تقریر پر چہ مگوئیاں ہوتی رہیں لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان کے اس بے باکانہ انداز پر کچھ کہنے کی جرأت کرتا۔ ایسے واقعات علی گڑھ، جدہ، ریاض اور جہاں بھی میں ان کی مشائیت میں گیا، بارہا دیکھنے کو ملے۔

جب آدمی بے لوث ہوجائے تو اس کی شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ قرآن مجید میں کلمة طیبة یعنی بھلی بات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اصلھا ثابة و فرعھا فی السماء ۔ ایک دوسری جگہ انسانی عمل کے ذرے ذرے کے حساب کی بات کہی گئی ہے: فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یرہ ۔ گویا بھلی بات کہنا فی نفسہ وہ نتائج پیدا نہیں کرتا جب تک اس کے پیچھے عمل، اخلاص اور ایقان کی قوت نہ ہو۔ واعظ وخطیب تو صبح شام اپنی آواز کا جادو جگاتے ہیں اور فقیہ شہر کی لغت ہائے حجازی بھی کم مرعوب کن نہیں ہوتی۔ لیکن خالی خولی گفتار کے اس کارخانے سے اگر کچھ برآمد نہیں ہوتا تو اس کا سبب یہی ہے کہ مخاطب دیکھتا ہے کہ کہنے والا محض الفاظ کا طومار باندھ رہا ہوتا ہے۔ حسنین سید کی سیدھی سادی گفتگو الفاظ کی جادوگری سے ماوراء ہوتی۔ وہ جس بات کی دعوت دیتے اس پر اپنی زندگی نچھاور کرچکے تھے۔ پہلی گفتگو میں ہی انھیں اس بات کا شدید احساس ہوتا کہ پتہ نہیں پھر ملاقات ہو یا نہ ہو سو دل کی بات کہہ ڈالی جائے۔ ملاقاتی خواہ طالب علم ہو یا عالم، عامی ہو یا خواص اسے اصلی، نسلی اور نقلی مسلمانوں میں فرق ضرور بتاتے اور پھر اسے اصلی مسلمان بننے اور شہادت حق کے فریضۂ منصبی پر متمکن ہونے کی پرُسوز دعوت دیتے۔ گفتگو میں ان کا انداز علمی قیل وقال کے بجائے نصح وخیر خواہی کا ہوتا۔ خالی خولی گفتگو کے وہ قائل نہ تھے۔ ملنے والے کو اس کی حیثیت اور سطح کے مطابق کرنے کے کام کی نشاندہی ضرور کرتے۔ تلقین کا یہ لہجہ اتنا شیریں اور ترغیبی ہوتا کہ ملنے والا اپنی بے عملی کے باوجود آئندہ ملاقات سے کتراتا نہ تھا اور نہ ہی

آپ کبھی اس کی کوتاہی پر اسے شرمندہ کرتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ داغدار شہرت والے لوگوں نے آپ کے ہاں آنا جانا شروع کیا، مخلصین اور اعزہ کے انتباہ کے باوجود آپ نے ان کی طرف التفات میں کوئی کمی نہ کی۔ دیکھتے دیکھتے ان میں سے بہتوں کی خصلتیں بدل گئیں۔ باقی جن میں اصلاح کا یارانہ تھا انھوں نے خود ہی اپنی راہ الگ لی۔

عزیز و اقارب ہوں یا احباب و متوسلین کوئی ان کے ہاں مارے باندھے کبھی نہیں گیا۔ آج ان کے غیاب میں جب ان کی یادیں اور ان کی باتیں زندگی سے کہیں زیادہ پراثر معلوم ہوتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلامِ سید کی جڑیں پہلے سے کہیں توانا اور اس کی شاخیں آسمانوں میں مسلسل پھیلتی جارہی ہوں، میرے لیے اس کی توجیہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ان کی باتوں میں خالی خولی الفاظ نہیں بلکہ عمل و اخلاص کے گوہر پیوست تھے۔ ان کی مجلس سے اٹھے عرصہ ہوا لیکن گفتگو کی تمازت اور لب و لہجہ کی مٹھاس سے اب تک مشامِ جاں معطر ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ کہتے ہیں کہ بھلے آدمی سے ملاقات کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ مقناطیس جب لوہے سے چھو جائے تو چند لمحوں کے لیے ہی سہی اس کے اندر بھی مقناطیسی صفت آ جاتی ہے۔ ان کی ذات میرے لیے ایک ایسے مقناطیس کی تھی جس نے بہت سے مقناطیس کو اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا۔ نہ جانے کتنے اصحابِ باصفا اور اہل دل سے میرا ابتدائی تعارف ان ہی کے ذریعہ ہوا۔ آٹھویں یا نویں جماعت کا طالب علم تھا، مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے کیمپس میں مولانا علی میاں ندوی کا خطاب عام تھا۔ میں بھی ان کی چھڑی پکڑے اجتماع گاہ میں حاضر تھا۔ جلسہ کے خاتمے کے بعد آپ نے مولانا سے تحسین آمیز الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ عرصہ بعد جب علی گڑھ میگزین کی اشاعت پر مولانا علی میاں کی طرف سے تائید و تحسین کا خط آیا تو بچپن کی یہ یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ اور پھر ایک عرصہ تک مولانا کی خصوصی کرم فرمائیوں سے کبھی لکھنؤ اور کبھی رائے بریلی میں مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا۔

علی گڑھ میں بی.اے کے طالب علم کی حیثیت سے جب میں لسانیات کے شعبے میں داخل ہوا تو مجھے یہ معلوم کر کے خوشگوار حیرت ہوئی کہ میرے استاد معروف ناقد اور مصنف پروفیسر

مسعود حسین خاں قرار پائے ہیں۔ میں ان کے نام سے واقف تھا اور ان کی بعض تصنیفات میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ مسعود صاحب کو جب یہ پتہ چلا کہ میں دربھنگہ کا رہنے والا ہوں تو انھوں نے کلاس ہی میں یہ پوچھ ڈالا کہ کیا میں دربھنگہ میں ان کے پرانے دوست حسنین سید سے واقف ہوں۔ ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے انھیں بتایا کہ میں ان کا بھتیجہ ہوں۔ علی گڑھ ہو یا دہلی، جماعتی حلقے ہوں یا سیکولر دانشوروں کی بزم، ان کی مشائیت میں اس چلت پھرت کا فائدہ یہ ہوا کہ خانوں میں بند رہنے یا اپنے من پسند افراد کے جھرمٹ میں زندگی جینے کے بجائے مختلف الخیال لوگوں سے ملنے، انھیں انگیز کرنے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ مجھے بسا اوقات بڑے ابا کے حلقۂ احباب کی وسعت اور بوقلمونی پر حیرت ہوتی۔ علماء و دانشور، متصوفین اور ملحدین، زاہد و رند، جاہ پرست اور قناعت کے شناور کی یہ ایک عجیب وغریب کہکشاں تھی۔ تب اس بات پر حیرت ہوتی کہ ان متضاد اور مختلف الخیال لوگوں میں ان کی یکساں پذیرائی اور غیر معمولی تعظیم کیوں ہے؟ آج جب اس نکتہ پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے اخلاص وعمل کا وزن تھا جو ہر ترازو میں اپنا وزن منوا لیتا تھا۔ ورنہ الفاظ تو محض ایک خالی پٹارہ ہے جس کی پشت پر اگر اخلاص وعمل کی قوت نہ ہو تو وہ صدائے واد کی طرح پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آ جاتے ہیں۔

ان کا معمول تھا کہ وہ عصر کے بعد شہر میں دعوتی ملاقاتوں کے لئے نکلتے۔ صبح میں گھر پر ملاقاتیوں کا سلسلہ ہوتا۔ ایک شام ان کے ساتھ شہر کے مشہور وکیل، جن کے صاحبزادے آگے چل کر مرکزی وزارت کے سزاوار ہوئے، کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ میری عمر یہی کوئی بارہ تیرہ سال رہی ہوگی۔ گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ اپنی پچھلی آمد پر وکیل صاحب سے گفتگو کر چکے تھے اور ان کی خدمت میں بعض شبہات کے ازالے کے لیے کچھ کتابچے بھی چھوڑ آئے تھے۔ وکیل صاحب بڑے زندہ دل، خوش اخلاق، بذلہ سنج اور کسی حد تک بے تکلف واقع ہوئے تھے۔ کسی قدر رلجاجت کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز میں کہنے لگے ''معاف کیجئے گا آپ نے جو کتابچے عنایت کئے تھے انھیں میں بالکل نہیں دیکھ سکا۔ کچھ دنوں تک اس خیال سے دروازے پر رکھے رہا کہ موقع ملتے ہی انھیں پڑھوں گا لیکن بدقسمتی سے ایک دن انھیں بکری چبا گئی''۔ وکیل صاحب کی اس بات پر کسی قسم کی خفگی

کے بجائے سید مرحوم کے چہرے پر تبسم کی ایک جھلک پیدا ہوئی، مسکراتے ہوئے فرمایا ''پھر تو آپ سے باشعور آپ کی بکری نکلی جس نے ان کتابچوں کو لائق التفات سمجھا''۔ وکیل صاحب نے قہقہہ لگایا اور دعوتِ دین کی یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچنے سے بچ گئی۔

کبھی کبھی ان کی یہ بذلہ سنجی اور حسِ مزاح طویل طولانی بحثوں سے نجات کا سبب بنتی تو کبھی منھ لگے طلباء و اعزہ اسے جوابی وار کے لیے استعمال کرتے۔ ملی پارلیامنٹ کے قیام کے بعد گرمی کی چھٹیوں میں جب میں ایک بار ان سے ملنے گیا تو انھیں اپنے سلسلے میں تشویش میں مبتلا پایا۔ کہنے لگے کہ علی گڑھ سے فلاں عالمِ دین (جو اس وقت یونیورسٹی میں ایک اہم عہد کے پر فائز تھے) تشریف لائے تھے۔ انھوں نے تمہارے سلسلے میں بہت سی باتیں کہی ہیں وہ جماعت سے قریب ہیں، مخلص ہیں، ان کا اصرار ہے کہ بھتیجے کو سمجھائے۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقع نہیں جب کسی نے بھتیجے کو سمجھانے کی بات کہی ہو۔ یہ بات تو ابوطالب سے بھی بہت سے لوگ کہتے رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ کے چہرے پر تبسم اور اطمینان کی ایک لہر سی آئی اور گفتگو کا رُخ دوسری طرف مڑ گیا۔

گوکہ سید مرحوم نے اپنے آپ کو ہمیشہ کامل یکسوئی کے ساتھ دعوت اسلامی کے لیے وقف کر رکھا تھا، اپنے خاندان، عزیز و اقارب اور بھائیوں کی تمام تر قوت اور خاندانی وسائل کی تمام تر جمع پونجی جماعتِ اسلامی کے قیام میں جھونک دی تھی لیکن اس کے باوجود جماعت کبھی بھی ان کے لیے بت نہ بن سکی۔ وہ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے کہ نجات کے لیے جماعت اسلامی سے وابستگی لازم ہے۔ حالانکہ اسی نسل کے بعض مخلصین پر یہ کیفیت پائی گئی کہ جب انھیں اس بات کی اطلاع ملتی کہ فلاں صاحب نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تو انھیں کچھ ایسا دھچکا لگتا گویا اس نے جماعت کو نہیں اسلام کو خیر باد کہہ ڈالا ہو۔ البتہ وہ پالیسی امور پر اختلاف کے سبب جماعت سے استعفیٰ کو نامناسب سمجھتے۔ وہ کہتے کہ استعفیٰ مسئلہ کا حل نہیں جماعت کے اندر رہ کر ہی اسے راہ راست پر رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جن دنوں دہلی سے ملی ٹائمز انٹرنیشنل شائع ہو رہا تھا، جماعت حکومتی عتاب سے تازہ تازہ نکلی تھی۔ اس موقع پر جماعت کے بعض قائدین کے بیانات سے ایسا

محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے پایۂ ثبات میں لغزش آ رہی ہو۔ صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس موقع پر ملی ٹائمز میں ایک مضمون ''یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا'' شائع ہوا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ جماعت اسلامی کی حیثیت دوسرے مسلم اداروں کی طرح امت کے ایک اہم سرمایے کی ہے۔ اگر اس کا نظری قالب کھوگیا تو یہ کسی مخصوص گروہ کا نہیں بلکہ پوری امت کا نقصان ہوگا۔ چند دنوں بعد مجھے سید علیہ رحمہ کا ایک مکتوب موصول ہوا جس میں آپ نے لکھا تھا:

> ملی ٹائمز انٹرنیشنل مئی کا پہلا شمارہ ملا۔ ''یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا'' پڑھا۔ جزاک اللہ...... میرے احساسات اور جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ حسین سلمہ گذشتہ دنوں یہاں آئے تھے تو دلی جاتے ہوئے محترم امیر جماعت اسلامی ہند کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے عملاً کسی لائق نہیں رہا مگر دعاء کر سکتا ہوں اور میری روزانہ کی دعاؤں کا ایک جز یہ بھی ہوتا ہے کہ اے اللہ جماعت اسلامی ہند کو مسخ اور منتشر ہونے سے بچا، جماعت اسلامی کو مومنین، مخلصین، قانتین، قانعین، شاکرین، صابرین اور مجاہدین فی سبیل اللہ سے نواز! اور اب دوبارہ امیر جماعت اسلامی ہند منتخب ہونے پر ان کو مبارکباد کا خط لکھ رہا ہوں۔ ان باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ گذشتہ سال جب چند دنوں کے لیے جماعت سے پابندی اٹھی تھی اس موقع پر مرکز جماعت اسلامی دہلی جانا ہوا تھا تو شفیع مونس صاحب سے معانقہ کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر پڑھ دیا تھا۔
>
> لا دینی ولا طینی کس پیچ میں الجھا تو　　دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الا ہو
>
> تو یہ ان کو بہت سخت لگا تھا اور تنہائی میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس پر شکوہ بھی کیا۔
>
> اللہ کرے کہ بقرعید کے موقع پر تم سب بھائی یہاں آ سکو۔ باقی باتیں ان شاء اللہ عند الملاقات۔

دین ان کے لیے فرقہ نہیں تھا اور یقیناً وہ ان لوگوں میں شامل نہیں تھے جو الذین فرقوادینھم وکانوشیعا کے مصداق ہوتے ہیں۔

ان کی دعاؤں کا مستحق بننے کے لیے یہ لازم نہیں تھا کہ خود کو ان کے چوکھٹے میں پوری طرح فٹ کیا جائے، جو بہت سے پارسانِ تقویٰ کے نزدیک پہلی شرط سمجھی جاتی ہے۔ کسی دینی جماعت کے نئے مرکز کا سنگ بنیاد رکھا جارہا ہو یا روایتی دینی مدرسوں کے قیام کی بات ہو یا رسمی مسلمانوں کی طرف سے قومی فلاح و بہبود کا کوئی منصوبہ، خیر کے تمام کاموں کو آپ یکساں خوش دلی کے ساتھ تعاون دیتے البتہ اس دوران اگر کوئی بات طبیعت پر گراں گزرتی یا انحراف وغلو کا ہلکا سا شائبہ بھی ہوتا تو آپ بلا تکلف فی الفور اپنے موقف سے آگاہ کردیتے۔

یہ غالباً ۱۹۸۸ء کی بات ہے جب مولانا علی میاں سے برسہابرس کے تعلق نے مجھے تصوف کا خوگر بنادیا تھا۔ مشاہدۂ حق اور زیارتِ رسول ﷺ کا شوق ہر وقت دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ سوڈان میں عربی زبان کی تعلیم کے دوران تیجانی صوفیاء کی صحبتوں نے میری طلب کو دوآتشہ کردیا تھا۔ اندھیری رات میں جب میں عبادت کے لیے اٹھتا تو بجلی کی روشنی سے طبیعت پر سخت گرانی محسوس ہوتی سو اس کا حل یہ نکالا کہ کمرے سے بجلی کے تمام تار کاٹ دیئے۔ رات کی تاریکی میں شمع کی لو جب ایک پر اسرار ماحول کو جنم دیتی تو ایسا لگتا گویا ارتکاز کی مطلوبہ منزل بس اب چند قدم دور رہ گئی ہو۔ ان دنوں میں مسلم یونیورسٹی کے قدوائی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ایک دن اچانک غیر متوقع طور پر سید مرحوم میرے کمرے میں آئے، وہ دلی جاتے ہوئے میری ہمت افزائی کے خیال سے ایک شب کے لیے علی گڑھ میں رُک گئے تھے۔ یہی کوئی مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہوگا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ تمام کمروں میں معمول کے مطابق بجلی آرہی ہے لیکن میرے کمرے میں اندھیرا ہے اور انھیں اصل سبب سے آگہی ہوئی تو وہ سخت خفا ہوئے اور افراط وتفریط سے بچنے کی نصیحت کی۔

جماعت ان کے لیے منزل نہیں بلکہ محض ایک وسیلہ تھی ان عظیم مقاصد کے حصول کا، جس کی خاطر انھوں نے اپنا سب کچھ تج ڈالا تھا۔ گو کہ انھوں نے ابوالاعلیٰ مودودی کی نظری رفاقت میں اپنی بیشتر صبحیں شام کی تھیں، ان کے نہاں خانۂ دل میں لاہور کا احیائی شاعر ہمیشہ سیدی مرشدی کے مقام پر فائز رہا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت ''میرے تین محسنین'' میں اپنے اس فکری مرشد کو بڑا

والہانہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی سمیت جن تین شخصیات کے تذکرے سے یہ تحریر عبارت ہے اقبال اس میں خصوصی افتخار و امتیاز کے حامل ہیں اور کیوں نہ ہوں آخر اسی محرم رازِ درونِ مئے خانہ نے تو سب سے پہلے ابوالاعلیٰ مودودی کے اندر مستقبل کے ایک مصلح کی تصویر دیکھی تھی اور ان کے لیے پٹھان کوٹ آنے اور وہاں دینی دعوت کے مرکز کے قیام کی راہ ہموار کی تھی۔ وہ زندگی بھر اقبال کی ژرف نگاہی کے قائل رہے اور اس بارے میں کبھی تذبذب کے شکار نہیں ہوئے کہ انتم العالون ان کنتم مومنین کے مصداق ؎

یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے فوجی انقلاب کے بعد چند ماہ اہل جماعت پر بڑے امید افزاء گزرے تھے۔ اسی دوران ابوالاعلیٰ مودودی نے انھیں لکھا تھا کہ ہم لوگ گذشتہ چھتیس برسوں سے جن مقاصد کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ اب ان کے حصول کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ ابھی چند دن اور توقف کیجئے کیا عجب کہ ہم بہت جلد ایک واقعی دارالاسلام میں آپ کا استقبال کرسکیں۔ میں نے یہ خط جب اپنے لاہور سفر کے دوران محبی نعیم صدیقی مرحوم کو دکھایا تو وہ آبدیدہ ہوگئے، کہنے لگے ہاں مولانا مودودی مرحوم ایک مرحلے پر ضیاء الحق کے سلسلے میں بڑے پر امید ہوگئے تھے۔ پاکستان میں فجرِ جدید کی امید صبح کاذب میں تبدیل ہوگئی البتہ خود ان کا اپنا احساس تھا کہ عالمی سطح پر امت مسلمہ کے حق میں ایک بڑی تبدیلی کی ابتداء اقوامِ ترک کی شمولیت کے بغیر ممکن نہ ہوسکے گی۔ برسہا برس بعد جب میں توپ کاپی سرائے (استنبول) میں پیغمبروں کے آثار، حضرت یوسف سے منسوب پگڑی، محمد ﷺ کی نعلِ مبارک اور حضرت علیؓ کی تلوار ذوالفقار کا مشاہدہ کررہا تھا اور اسی موقع پر عثمانی خلفاء کے آثار میں غلو و انحراف فکری کے مشاہدے کا موقع ملا تو اس موقع پر سید مرحوم کا وہ خط مجھے خاص طور پر یاد آیا جس میں انھوں نے اپنے ایک خواب کے حوالے سے ترکوں کی کج کلاہی کے باجود مستقبل میں ان کے عظیم اسلامی رول کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد جب بھی استنبول جانے کا اتفاق ہوا، میں نے ترکوں میں اس خواب کی تعبیر کے کہیں بہتر امکانات دیکھے۔ آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں عالم اسلام میں

ترکوں کی واپسی کا چرچا عام ہے۔ یورپین یونین سے ٹھکرائے جانے کے بعد مشرق کی طرف ترکوں کا دیکھنا اور اقوام عالم میں اپنے سابقہ اسلامی رول کی خواہش آج ایک عملی خیال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ربع صدی پہلے اس امکان کی نشاندہی وہی لوگ کر سکتے تھے جنھیں قدرت نے صاحبِ نظری کے منصب پر از خود مامور کیا ہو۔

۳

سیدِ مرحوم کے اقبالی مشن کا کوئی تذکرہ مکتبہ اسلامی کے بغیر نامکمل رہے گا جسے ان کے پہلے دعوتی پڑاؤ کی حیثیت حاصل ہے۔ جامعہ سے واپسی اور قیامِ جماعت کے فوراً بعد شہر دربھنگہ کے عین قلب میں آپ نے مکتبہ اسلامی کی بنا ڈالی۔ ابتداً یہی جماعت کا دفتر بھی تھا اور دارالنشر بھی۔ بہت جلد یہ جگہ اپنے اسٹریٹجک محل وقوع کی وجہ سے ایک سرگرم مرکز میں تبدیل ہوگئی۔ بظاہر تو یہ کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی لیکن یہاں تجارت سے کہیں زیادہ انقلاب انگیز خیالات کی مارکٹنگ ہوتی۔ اصحابِ علم وفن کی بڑھتی تعداد کی وجہ سے جب جگہ کی تنگی کا احساس ہونے لگا تو خاص دفتر کے لیے برابر کی ایک اور دکان کرایے پر لے لی گئی۔ پہلی نسل کے وابستگان نے عزیمت کی غیر معمولی داستان رقم کی۔ جس کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے اس مشن کو سونپ ڈالا۔ بہت جلد شمالی ہند کے مختلف شہروں میں اس دعوت کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ کام کو پھیلتا دیکھ کر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایماء پر آپ نے مکتبہ کو اپنے چھوٹے بھائی اور میرے والد حافظ محمد نور الھدیٰ صاحب کے سپرد کیا اور خود پٹنہ، کلکتہ اور گوہاٹی جیسے اجنبی مقامات پر مراکز کے قیام کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے بھائیوں نے اس مشن میں نہ صرف یہ کہ ان کا بھر پور ساتھ دیا بلکہ سیدی و والدی حافظ محمد نور الھدیٰ تو چھیاسٹھ سال تک اس ذمہ داری کو بہ نفسِ نفیس انجام دیتے رہے۔ اس دوران مکتبہ صرف ان ایام میں بند رہا جب حکومت نے ایمرجنسی کے دوران والد صاحب کو گرفتار کرلیا اور مکتبہ کو اس وقت تک سیل رکھا جب تک کہ کورٹ سے اس کے کھلوانے کے احکامات جاری نہ ہوگئے۔ اس دوران مکتبہ پر مختلف حالات آئے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات یہ محسوس ہوا کہ اب مکتبہ کی وہ افادیت باقی نہیں رہ گئی ہے لیکن والد صاحب چونکہ اسے اس مشن کا تسلسل سمجھتے رہے ہیں

اس لیے وہ اسے کبھی بند کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ نہ جانے کتنے لوگ یہاں کی غیر رسمی تعلیم سے مہمیز پا کر آج دنیا کے مختلف علاقوں میں خدمتِ اسلامی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ چند برس پہلے جب مرحوم قاضی مجاہد الاسلام قاسمی شدید علیل تھے، میں دہلی میں ان کی عیادت کو گیا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے "والد صاحب کو میرا سلام پہنچایئے گا۔ میں ان کے لطف و کرم کا ممنون ہوں۔ جب میں چھوٹا تھا وہیں ان کے پاس مکتبہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا"۔

مکتبہ جہاں میرے بچپن کا بڑا حصہ گذرا میرے لیے آج بھی ایک رومان انگیز خیال ہے ۔ یہ میرے لیے صرف نئی کتابوں تک رسائی کا ذریعہ نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے علمی چوپال کی تھی جہاں شب و روز مختلف عنوانات پر مجلسیں جمتیں۔ میں ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے بزرگوں کی ان مجالس میں شوق و حیرت کا مجسمہ بنا ہوتا۔ بہت سی باتیں تو اس وقت سمجھ میں نہ آتیں البتہ بعض جملوں کی بازگشت آج بھی حافظے میں موجود ہے۔ خلافتِ ابوبکر و علی پر بحث ہو رہی تھی۔ سیدی ووالدی کچھ اس طرح گویا تھے: "محمود عباسی کی کتاب کے بعد علمی حلقوں میں بڑی بے چینی تھی۔ قاری طیب صاحب نے جواب دینے کی کوشش تو کی لیکن ان کی کتاب میں ان چبھتے اعتراضات کا جواب نہ تھا جو محمود عباسی نے اٹھائے تھے البتہ ابو الاعلیٰ مودودی نے خلاف وملوکیت میں ان سوالات کے تاریخی اور عقلی جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے"۔ بچپن میں سنے سنائے اس قسم کے جملوں نے آگے چل کر میرے اندر تحقیق و جستجو کی جوت جگانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

ایک بار کا ذکر ہے، میں مکتبہ میں کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا۔ اسی دوران مولانا افتخار احمد صاحب منیار پوری (جو اخبار دعوت کے استحکام کے بعد وطن لوٹ آئے تھے) مکتبہ میں داخل ہوئے۔ ابھی والد صاحب سے ان کی ابتدائی گفتگو کا آغاز ہی ہوا ہوگا کہ لاؤڈاسپیکر پر جماعت کے کسی پروگرام کا اعلان سنائی دیا۔ اعلان کرنے والا بڑی خوبصورت اور مؤثر زبان میں دعوت پیش کر رہا تھا۔ افتخار صاحب کو تجسس ہوا، فرمایا "ذرا باہر دیکھ کر آؤ رکشہ پر اعلان کرنے والا کون ہے؟" وہ ایک نوجوان تھا جس کی خطابت اور ذہانت جملوں کے زیر و بم سے عیاں تھی لیکن میں اس سے واقف نہ تھا۔ میں نے آ کر رپورٹ دی، پتہ نہیں کون ہے، میں نے پہلی بار دیکھا

ہے'' لگتا ہے کوئی نیا پھنسا ہے''۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا لیکن اس جملے کی کاٹ کا واقعی مجھے اندازہ نہ تھا۔ افتخار صاحب نے، جنھیں ہم لوگ قرابت کے رشتے سے افتخار نانا کہتے تھے، تادیبی انداز سے بس اتنا کہا ''ہاں بیٹا! ہم لوگ تو پرانے پھنسے ہوئے ہیں۔''

سچ تو یہ ہے کہ سید مرحوم کی سحر انگیز شخصیت نے پورے خاندان، حتی کہ دور دراز کے رشتہ داروں کو بھی دعوتی مشن کا اسیر بنادیا تھا۔ ان میں سے اکثر کسی رسمی تنظیمی تعلق سے ماوراء تھے لیکن ان سبھوں میں فاستبقواالخیرات کی اسپرٹ وافر مقدار میں پائی جاتی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں اجتماعِ دربھنگہ کے موقع پر جب جماعت اسلامی کی حیثیت ایک اجنبی پودے کی تھی اور جب بعض تاسیسی اراکین کے داغ مفارقت دے جانے کے سبب جماعت کی ہوا اکھڑ چکی تھی ایک بڑے زونل اجتماع کا خیال بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس اجتماع سے منتشر ہوتے ہوئے کاروان کو فی الفور قوت اور استحکام حاصل ہوا۔ سید مرحوم نے اس اجتماع کا سارا بوجھ اپنے خاندان اور عزیز و اقارب پر ڈال دیا۔ والد صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ حکیم عبدالاحد صاحب (والد مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ؒ) کے ساتھ مل کر شہر کے ٹاؤن ہال میں اجلاس عام کا انتظام سنبھالیں اور خود اجتماع عام اور مہمانوں کے انتظامات میں لگ گئے۔

اس عہد کے جامعہ سے فارغ التحصیل ایک ابھرتے نوجوان قلم کار کی آرزوؤں کو متصور کیجئے تو ان کا قد اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بڑھ جاتا ہے۔ خدا نے انھیں فکر و قلم کی بے پایاں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ جامعہ میں وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ استاد محترم ذاکر حسین کی شفقت انھیں تمام عمر حاصل رہی۔ وہ اگر چاہتے تو صلاحیت، صالحیت اور روابط کے سہارے دنیا کا وافر حصہ حاصل کر سکتے تھے، اور اگر روایتی استغنیٰ کو اپناتے تو کم از کم ایک مصنف اور مفکر کی حیثیت سے اپنی عظمت کا ایک بڑا بت تراش سکتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اقبال کی آرزوؤں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی انشاء پردازی کو بڑے سلیقے سے کام پر لگا رکھا ہے تو انھوں نے تصنیف و تالیف سے شغل کرنے یا کتابوں کا انبار لگانے کہ بجائے رجال کار کی تیاری کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ انھوں نے کتابیں تصنیف نہیں کیں

ہاں ایسے مخلصین ضرور تصنیف کیے جو اعلیٰ علمی صلاحیتوں ، بلند نگہی اور ایثار کا مرقع ثابت ہوئے اور جن کی بے پایاں قربانیوں کے سبب بیسویں صدی میں تحریکِ اسلامی کا ایک پیمبرانہ قالب تشکیل پاسکا۔

اقبال کی نواسنجی کی بازگشت جب تک سنائی دیتی رہے گی اور اس نغمے کے شناور اس دنیا میں جب تک باقی رہیں گے ہمارے درمیان قدسیوں کی ایک ایسی نسل برابر پیدا ہوتی رہے گی جنھیں پیغمبر ہونے کا دعویٰ تو نہ ہو ہاں کارِ پیمبری کی لذت سے ان کے حواس آشنا ہوں ؎

دوعالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

راشد شاز
۱۵/اگست ۲۰۰۹ء نئی دہلی